رُودادِ ابتلاء : احمد رائف مصری

ترجمہ جناب خلیل الحامدی

(۷)

ابوزعبل جیل کی بیرک میں تین دن گزر گئے۔ میں یہ خیال کرتا رہا کہ اب میری تفتیش پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی ہے۔ اس دوران میں بیرک کے دروازے سے باہر جھانک کر تعذیب کی رنگا رنگی دیکھتا رہا۔ تعذیب کے اسالیب کا مشاہدہ مجھے تعذیب کا نشانہ بننے والوں سے زیادہ مبتلائے الم کرتا۔ بیرک کا دروازہ جیل کے صحن کی جانب تھا۔ صحن کو جیل کی اصطلاح میں "محمصہ" (ادکھلی) کہا جاتا تھا۔ صحن میں ان لوگوں کو بھر دیا جاتا جو تفتیش کے لیے اپنی باری کے انتظار میں ہوتے یا جنہیں تفتیش کے لیے تیار کیا جاتا۔ سب انسان اُسی طرح ننگے ہوتے جس طرح ان کی ماؤں نے انہیں جنا تھا۔ افسران شام کو اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے۔ اور ان لوگوں کو نیند کی اجازت دیے بغیر چھوڑ جاتے اور صبح واپس آتے تاکہ تفتیش کے سلسلے میں کل جو کسر رہ گئی تھی اُسے آج پوری کرلیں۔ دوسری اذیتوں کے ساتھ ان لوگوں کو رت جگا کی اذیت دی جاتی، اگرچہ رت جگا بھی بذاتِ خود بڑا المناک اور چھکے چھڑا دینے والا عذاب ہے اور اس کی شدت وہی سمجھ سکتا ہے جس کا اس سے پالا پڑا ہو ــــ یہ کتنا بڑا عذاب ہے کہ انسان کئی کئی دن تک نہ سوئے۔ اس پر مستزاد یہ کہ یہ ظالم افسران ان لوگوں کے ساتھ جبر و استبداد کے سنگین ترین ہتھکنڈے استعمال کریں جسمانی ایذا کے لیے بھی اور ذہنی ایذا کے لیے بھی۔ شومئی قسمت سے کچھ عرصہ بعد خود میں بھی ان میں شامل ہوگیا۔

یہ مجبور و مقہور انسان دیوار کی طرف منہ کرکے کھڑے ہوتے۔ ان کی آنکھوں پہ دبیز پٹی بندھی ہوتی۔ اسی حالت میں گھنٹوں گزر جاتے۔ کوئی یہ نہ جانتا کہ رات کب ختم ہوئی اور دن کب طلوع ہوا۔ اگر کسی کے جی

بیں آنا کر پٹی آنکھوں سے اُتار دے جس نے اُس کے دل و دماغ کو تاریکی ظلمت کے اندر غرق کر رکھا ہے تو اس کے لیے ہلاکت اور تباہی تیار تھی۔ ہر آدمی بلند آواز سے ایک مخصوص فقرہ دہراتا۔ اگر آغاز شب میں وہ یہ رٹ شروع کرتا تو صبح طلوع ہونے کے بعد دوسرا حکم جاری ہونے تک وہ اسے رٹتا رہتا ——— ایک مجنونانہ سا فقرہ جس کے اعادہ کے لیے اُسے قطعاً نہ اُکتانا چاہیے ورنہ عذابِ الیم کا آتشین طوفان اُسے لپیٹ میں لے لے گا ——— وہ فقرہ یہ ہے: "سمندر میں ساگ ہے" ——— بالکل ہی عبارت! ایک باشعور انسان اسے چلّا چلّا کر گھنٹوں رٹ رہا ہے، یا مثلاً کوئی ہندسہ منتخب کر لیا جاتا کہ اسے دُہرایا جائے۔ سات یا آٹھ یا نو، کوئی سا ہندسہ اور رات بھر اُسے بلند آواز سے بار بار پڑھا جائے ——— یہ منظر دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ یہ جیل نہیں ہے پاگل خانہ ہے۔

جو اس جگہ پہنچ گیا اُس کے لیے کئی روز تک نیند اور کھانا حرام ہو جاتا۔ صبح سے شام تک اُسے صرف ایک گلاس پانی ملتا۔ اور جب اُسے ضروری حاجت لاحق ہوتی تو اُسے اپنی جگہ پر ہی قضا کرنا ہوتا تھا۔

کچھ لوگ "اوکھلی" کے اندر لوہے کی سلاخوں کی بلند دیوار پر کئی کئی گھنٹے بٹھا دیے جاتے۔ گھنٹوں تک بیٹھنے والا انسان آخر تھک کر دیوار کی بلندی سے نیچے گر پڑتا۔ اُس کا سر پھوٹ جاتا، یا پنڈلی ٹوٹ جاتی یا کوئی اور چوٹ لگ جاتی۔ کچھ ہو جائے کسے اس کی پروا تھی۔

کبھی کبھی بعض افسروں کو یہ سوجھتی کہ وہ "اوکھلی" کے اندر گھرے ہوئے مجبور و مقہور انسانوں سے اپنا دل بہلائیں۔ چنانچہ وہ آکر اُن کے ساتھ اپنا "اچھا وقت" گزارتے۔ اور اذیت دینے کے جتنے فن انہیں معلوم ہوتے یا ان کا ذہن اختراع کرتا وہ دل لگی کے طور پر اُسے روبکار لاتے۔ مثلاً: وہ سب لوگوں کو ایک طویل قطار میں ایک دوسرے کے پیچھے کھڑا کر دیتے۔ اور خود قطار کے آخر میں کھڑے ہو جاتے۔ قطار کے آخر میں کھڑے ہونے والے شخص کو دونوں ہاتھوں سے ایک زور کا بُت مارتے جو پُرسکوت رات کے اندر گونج پیدا کر دیتا۔ اور پھر اُسے یہ حکم دیتے کہ وہ خود اگلے آدمی کو اسی قوت سے بُت مارے یہاں تک کہ قطار کے دوسرے سرے پر جو شخص کھڑا ہے باری اُس تک جا پہنچے۔ اور مزید شرم کی بات یہ ہے کہ فوجی افسر اس دوران میں اپنی گھڑی پر نظر رکھتے اور اندازہ لگاتے کہ اس کا یہ شرمناک اور اذیت بخش "پیغام" آخری انسان تک کتنے وقت میں پہنچا ہے۔ اور پھر اس "شرمناک کھیل" میں حصّہ لینے والے نکبت زدہ انسانوں پر بگڑ جاتے کہ وہ سست رفتاری سے کام لیتے ہیں۔ انہیں دھمکیاں دیتے اور طرح طرح

کی وعیدیں سُناتے ۔ اُن کا مطالبہ یہ ہوتا کہ یہ حرکت کم از کم وقت میں زیادہ سے زیادہ رفتار کے ساتھ کی جائے۔

یہ لوگ ذہن و شعور کی قوت کھو چکے ہوتے ۔ بُری طرح چکنا چور ہو جاتے ۔ اِس ناپاک کھیل میں ان کی انسانی حس ماؤف ہو جاتی ۔ ہر شخص تخفیف عذاب کے لالچ میں اس افسر کو خوش کرنے کی کوشش کرتا اور اُسے خوش کرنے کی ایک ہی تدبیر تھی کہ وہ اپنے سامنے والے شخص کو زیادہ سُرعت اور قوت سے تھپڑ مارے۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد یہ فعل اس قدر توہین آمیز اور رُسواکُن صورت اختیار کر لیتا کہ اُسے دیکھ کر انسانیت آنسو بہاتی رہ جاتی ـــــ البتہ افسر صاحب باچھیں کھلا کھلا کے ہنستے ۔ اور پورے ماحول میں صرف وہی ایک ہنسنے والے ہوتے ۔ کائنات کی دوسری ہر چیز اس پر اشکبار ہوتی۔

جو افسران میری قطار میں یہ کھیل رچاتے رہے ہیں اُن میں میجر ز ۔ ع تھا ۔ اس شخص نے مزید یہ کیا کہ نظر بندوں کی دو قطاریں بنائیں اور انہیں ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑا کر دیا ۔ اور ایک قطار کو حکم دیا کہ وہ دوسری کو تھپڑ مارے ۔ یہ کھیل باری باری ہر قطار انجام دیتی ۔ میجر یہ دیکھتا رہتا کہ کون تھک ہار کر گر گیا ہے ۔ یہ کھیل کئی کئی گھنٹے جاری رہتا ۔ جب کوئی شخص درماندہ ہو کر گر جاتا تو میجر کی باچھیں کھل جاتیں۔

دیوار پہ جو لوگ لٹک رہے تھے ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں یا اس کے جسم پہ ایک کاغذ ہوتا تھا جسے "روشتہ" کہا جاتا تھا ۔ اس کاغذ میں اُس کے ساتھ معاملے کا طریق کار درج ہوتا تھا ـــــ یعنی: نام، بیت الخلاء جانے کا وقت، پانی کا ایک گلاس پینے کا وقت، روٹی کھانے کا وقت، اور اُسے زدوکوب کرنے کا وقت ـــــ رسد کا حساب دنوں کی رُو سے کیا جاتا مگر زدوکوب کا حساب گھنٹوں کے لحاظ سے ہوتا ۔ یعنی پانی دن میں ایک بار، مگر زدوکوب کے لیے ایک "بوچھاڑ" سے لے کر دوسری "بوچھاڑ" تک صرف دو گھنٹے کا وقفہ۔

ایک صبح ایسی بھی طلوع ہوئی کہ چڑیوں کے چہچہوں کے ساتھ ہی میں بھی "اوکھلی" میں داخل ہو چکا تھا اور مجھے بھی چلتے ہی ایک "طریحہ" لینا پڑا یعنی ڈنڈوں کی لگاتار خوراک ۔ میں نے تقریباً دو سو ڈنڈے کھائے اور پھر لوہے کی سلاخوں پہ لٹکا دیا گیا ۔ مجھے یہ "طریحہ" (ڈنڈوں کی لگاتار بوچھاڑ) ہر ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ملتی رہی۔

تین روز تک میں آہنی سلاخوں پر لٹکا رہا ۔ نیند اور آرام سے محروم ۔ آج بھی اس واقعہ کی یاد دل کو ہلا دیتی

ہے۔ اس واقعہ کا اظہار تو چند لفظوں میں ہو جاتا ہے جنہیں انسان ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں ادا کر سکتا ہے۔ لیکن اُس وقت یہ واقعہ میرے لیے اس قدر شدید و سنگین تھا کہ بیان سے باہر ہے، اور الفاظ اس کا احاطہ کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ واقعہ اب بھی خدا کی یاد اور آخرت کا خوف دلا دیتا ہے۔ میرے پہلو میں ایک ڈاکٹر صاحب بھی لٹکے ہوئے تھے ——— سُنا ہے وہ مصر کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ گئے ہیں ——— اُن کی حالت مجھ سے بھی بدتر تھی لیکن اس کے باوجود انہیں مجھ پر بڑا ترس آرہا تھا۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ درد گردہ کا بیمار بن جاؤں۔ اس مرض کی علامات بھی انہوں نے مجھے تفصیل سے بتا دیں۔ میں نے بہتر یہ سمجھا کہ ابھی ان علامات کو محفوظ رکھوں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی دن یا کوئی گھڑی ایسی آوارد ہو جو موجودہ صورتِ حال سے بھی زیادہ سنگین ہو۔ اور اُس وقت یہ حربہ کام آئے گا۔ کوئی پوچھ سکتا ہے کہ کیا وہ لوگ دردِ گردہ کے مریض کے ساتھ رعایت کرتے تھے؟ جواب: جی ہاں، اسی قدر رعایت کرتے تھے جس سے انسان اُس وقت تک زندہ رہے جب تک تفتیش مکمل نہیں ہو جاتی۔ معلومات حاصل کرنے کا لالچ انہیں ہمیں زیادہ دیر تک زندہ رہنے کا خواہشمند بنائے رکھتا تھا۔

سنگین گھڑی آہی گئی ——— میجر ف۔ ع کی سرپرستی میں میری طرف اژدہا جیسے ڈنڈوں کا رُخ ہو گیا۔ سخت بوچھاڑ ہونے لگی۔ شدتِ کرب سے میرا دماغ چل گیا۔ اور میں پاگلوں کی طرح چیخیں مارنے لگا۔ اور واویلا کیا کہ مجھے دردِ گردہ کی شکایت لاحق ہو گئی ہے ——— یہ سُن کر انہوں نے مارسے ہاتھ کھینچ لیا جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں وہ مجھ سے معلومات حاصل کیے بغیر ——— جو ان کے خیال کے مطابق میرے پاس تھیں ——— مجھے جان سے مار دینا پسند نہیں کرتے تھے۔

جیل کا بدمعاش ڈاکٹر آیا اور اس نے مجھے درد کا انجکشن دے دیا۔ اور مجھے استراحت کی ہدایت کی۔ اور میری استراحت یہ تھی کہ میں پوری رات دیوار کے پہلو میں جاگتے ہوئے بیٹھا رہوں۔ چنانچہ یہ استراحت مل گئی مگر ظاہر ہے کہ نیند کی اجازت نہ ملی۔ یہ بڑی کٹھن رات تھی۔ نیند مجھ پر ہر طرف سے حملہ آور ہو رہی تھی اُسے روکنے کا عذاب میرے لیے تازیانوں کی مار اور آگ کے داغوں سے زیادہ سخت تھا ——— یہ بات صرف تجربے سے معلوم ہو سکتی ہے۔

صبح ہوئی۔ اب ایک نئی افتاد آپڑی۔ ہمیں حکم ملا کہ ہم پشت کے بل لیٹ جائیں اور اپنی ٹانگیں اُوپر ہوا میں اُٹھالیں۔ اور ہم ایک طویل قطار میں برابر لیٹیں۔ بریگیڈیر اے آر ہمارا معائنہ کریں گے۔ بریگیڈیر آگیا،

اس کی اردل میں تین ہٹے کٹے سپاہی تھے۔ نئے احکام کے تحت ہم نے آنکھوں کی پٹی کے اوپر جیکٹ ڈال رکھے تھے تاکہ چہرے کی کوئی چوٹ ظاہر نہ ہو۔ بریگیڈیر نے قطار کے ابتدائی سرے سے معائنے کا آغاز کیا۔ ہر شخص کے قریب ہو کر اس کا نام دریافت کرتا۔ وہ اپنا نام بتاتا۔ بریگیڈیر کو پہلے سے نہ صرف تمام لوگوں کے نام یاد تھے بلکہ وہ ان کے تفتیش طلب موضوعات سے بھی آگاہ تھا۔ ہر شخص کا نام پوچھنے کے بعد متعلقہ موضوع کے بارے میں بھی اُس سے سوال کرتا۔ اور حسب معمول وہ اُس کے جواب سے خوش نہ ہوتا۔ اور اپنے ایک سپاہی کو زیر لب کہہ دیتا: "پچاس" یا کہہ دیتا: "تیس" اور بعض اوقات "سو" کا حکم بھی صادر فرماتا۔ اس تعداد کا مطلب یہ تھا کہ چوب زنی کے ذمہ دار لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ بریگیڈیر نے جس شخص کے متعلق جو تعداد بتائی ہے اُس سے کم کسی حالت میں اُسے ڈنڈے نہ لگائے جائیں۔ ان لوگوں کے تیس ڈنڈے پچاس کے مساوی اور پچاس اسّی کے مساوی ہوتے تھے۔ جو شخص قطار کے آخر میں لیٹا تھا اُس کے لیے لازم تھا کہ وہ اُس وقت تک ٹانگیں اُوپر اُٹھائے رکھے جب تک بریگیڈیر وہاں تک پہنچ نہ جائے۔ اگر کوئی بے بس ہو کر ٹانگیں نیچے کر لیتا تو اُس کی شامت آجاتی۔ اُس کی یہ لوگ تکا بوٹی کر دیتے۔

صبح سویرے یوں لیٹنے کا سلسلہ روزانہ کا معمول بن گیا اور یہ دو ڈھائی گھنٹے تک جاری رہتا۔ لوگوں نے رات بھی اس حالت میں گزاری ہوتی کہ ان کے قویٰ چکنا چور ہو تے۔ کیونکہ وہ پوری رات لازمی ورزشوں یا ڈنڈوں کی ضربات، یا لوہے کی سلاخوں پر معلّق ہو کر گزارتے۔ اور اب پاؤں جسم سے جدا ہو چکے ہوتے۔ اور پھر "فطارِ صبحگانہ" سے فارغ ہوتے ہی ہر شخص لوہے کی سلاخوں والی دیوار پر اپنی اپنی جگہ پر چڑھ جاتا۔ اور ہر ایک اس انتظار میں ہوتا کہ افسر آئے اور اُس کی تفتیش کا آغاز کرے۔

رات کے وقت میجر ف۔ ع میرے پاس آیا۔ بد قسمتی سے میرا قرعہ فال اُس کے نام نکلتا رہا یا اُس کا قرعۂ فال میرے نام۔ دیوار کے باہر میری طرف رُخ کر کے کھڑا ہو گیا۔ وہ یہ دیکھ کر طیش میں آگیا کہ میں نے لباس پہن رکھا ہے۔ "محمصر" میں ڈیوٹی پر جو سپاہی تھا اُسے طلب کیا اور اُسے بے حد فحش گالیاں دے کر کہنے لگا کہ "کس ذلیل نے اسے لباس پہننے کی اجازت دی ہے"۔ سپاہی نے اُسے بتایا کہ یہ دردِ گردہ میں مبتلا ہے۔ اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق ہی اسے یہ سہولت دی گئی ہے۔ میجر صاحب نے خود ڈاکٹر کو بھی مغلظات سے نوازا۔ اور یہ جھگڑا یوں ختم ہوا کہ میں دیوار پر سے اُتار دیا گیا اور تمام کپڑے اُتار کر مجھے خوب گرم "بوچھاڑ" دی گئی۔ یہ "خوراک" لینے کے بعد دوبارہ دیوار پر جا بیٹھنے کا حکم ہوا ——

میجر پھر میرے قریب ہوا۔ اُس کی آنکھوں میں انتہائی خوفناک چمک تھی۔ ہاتھ میں جلتا ہوا لائٹر لے رکھا تھا۔ جب اُسے میں نے اپنے ننگے جسم کے ساتھ آگے بڑھتے دیکھا تو بدحواس ہو گیا۔ میں نے خیال کیا کہ اگر یہ شعلہ میرے جسم پر لگا دیا گیا تو میں تو بلاشبہ مر جاؤں گا۔ میجر نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ میرے جسم کے مختلف حصّے لائٹر سے جلا دیے۔ مجھے شدید تکلیف ہوئی، ناقابلِ بیان تکلیف، سڑی ہوئی کھال کی بُو خود مجھے آنے لگی ——— مگر پھر بھی موت نہ آئی۔

میجر ف۔ ع نے فضول اور نہ ختم ہونے والی گفتگو چھیڑ دی اور وہ یہ تھی :

س : کیا تم کچھ نہیں کہنا چاہتے ؟

ج : کس چیز کے بارے میں ؟

س : اس مرتبہ ہم معین بات سننا چاہتے ہیں۔

ج : وہ کونسی معین بات ؟

س : یحیٰی حسین کے بارے میں کیا جانتے ہو ؟

ج : جو کچھ مجھے معلوم تھا میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ کوئی اور بات میرے پاس نہیں ہے ؟

س : کیا تمہیں معلوم تھا کہ وہ الاخوان المسلمون کی خفیہ تنظیم کا رکن ہے ؟

ج : ہرگز نہیں۔

س : تمہاری آخری ملاقات اُس سے کب ہوئی ؟

ج : چند ماہ پیشتر۔

س : یعنی وہ سوڈان بھاگنے سے پہلے تم سے نہیں ملا ؟

ج : ایسی کوئی صورت پیش نہیں آئی۔

س : تو گویا آپ الاخوان المسلمون کی تنظیم کے رکن ہیں ؟

ج : ہرگز نہیں۔

س : تم اُس کے رکن کیوں نہیں بنے ؟

ج : اس سوال کا جواب بہت مشکل ہے۔

س : بات کی وضاحت کیجیے ؟

ج: کیا آپ کی رائے ہے کہ میرے لیے یہی مناسب تھا کہ میں اخوان کی تنظیم کا رکن ہوتا؟

س: اسی چیز کی آپ ہمارے سامنے تشریح کریں۔

ج: جس تنظیم سے آپ کی مراد ہے اس میں مجھے شمولیت کی دعوت نہیں دی گئی۔

س: اس کے باوجود کہ آپ ان کی بہت بڑی تعداد سے واقف ہیں؟

ج: جی ہاں، اس کے باوجود کہ میں ان کی بہت بڑی تعداد سے واقف ہوں۔

س: تم جھوٹ بول رہے ہو۔

ج: پھر سچ کیا ہے؟

س: سچ یہی ہے کہ تم اخوان کی تنظیم کے رکن ہو۔ یہ بات تمہیں تسلیم کرنا پڑے گی۔ سمجھے؟

ج: سمجھ گیا ہوں۔

س: اچھا تو بتاؤ کیا کہتے ہو؟

ج: آپ کے فیصلے کے بعد میں اب کیا کہہ سکتا ہوں۔ یہی کہ میں اخوان کی تنظیم کا رکن ہوں۔

س: تنظیم کی قیادت سے بھی تعلق ہے!

ج: تنظیم کی قیادت سے بھی تعلق ہے۔

س: بلکہ تم تنظیم کے ایک لیڈر رہو۔

ج: ----------

س: خاموشی کیوں اختیار کر لی ہے؟

ج: سمجھ نہیں آتا کہ کیا کہوں۔

س: (میجر پھنکارتے ہوئے) تمہیں کہنا ہوگا۔ ورنہ تمہارا انجام بہت برا ہوگا۔

ج: ہم متفق ہیں۔

س: کس چیز پہ؟

ج: یہ کہ میں تنظیم کا ایک لیڈر رہوں۔

س: یہ اقرار نامہ تحریر کرنا ہوگا ___ ایسا ہی ہے نا!

ج: بشرطیکہ عذاب سے نجات مل جائے۔

س: ہم متفق ہیں۔ مار پیٹ سے تمہیں نجات دے دیتے ہیں۔ آؤ۔ کیا لکھو گے؟

ج: یہی لکھوں گا کہ میں الاخوان المسلمون کی جماعت کا رکن ہوں۔

س: پھر؟

ج: پھر یہ لکھوں گا کہ میں تنظیم کا ایک لیڈر رہوں۔

س: پھر ہمیں اخوان تنظیم اور اس کی قیادت کے بارے میں مکمل تفاصیل بتانا ہوں گی۔

ج: میجر صاحب! یہ بات ناممکن ہے۔ جو الفاظ آپ نے کہے ہیں۔ ان سے زیادہ میں ایک لفظ بھی نہیں لکھوں گا۔ آپ جو چاہیں میرے ساتھ کریں۔ جو کچھ کہا ہے اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا.... یقین جانیے۔

اس کے بعد مجھے سنگین عذاب کے کولھو میں جوت دیا گیا۔ بدبختی، الم اور کرب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ یہ کارروائی عام گرفتاریوں کے حکم سے پہلے جو ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو صادر ہوا، عمل میں آئی۔ عام گرفتاریوں کا حکم صادر ہونے کے بعد ہر بات میں تبدیلی واقع ہوگئی۔ کیونکہ اس حکم میں صاف کہہ دیا گیا کہ اخوان المسلمون کے جو لوگ پہلے (۱۹۵۴ء میں) گرفتار ہوئے تھے ان سب کو دوبارہ گرفتار کر لیا جائے۔ اور مزید یہ کہ وزیر داخلہ کو یہ اختیارات دے دیے گئے کہ وہ جس شخص کو بھی مشکوک سمجھتا ہو اس کی گرفتاری کے احکام صادر کر سکتا ہے ——— یہ بھی ایک مستقل کہانی ہے۔

۴ ستمبر ۱۹۶۵ء کی بات ہے کہ گرفتاریوں کے ہمہ گیر حکم سے پہلے ابوزعبل کی جیل میں نظر بندوں کی بہت بڑی کھیپ آئی۔ اس میں میرا بھائی بھی تھا۔ جس کا اس وقت کسی سے کوئی تعلق نہیں تھا، ماسوائے اس کے کہ میرے ایک دوست کے ساتھ اس کی جان پہچان تھی۔ میرے بھائی نے کسی تقریب پر اسے رسمی خط بھیج دیا۔ میرا دوست یحییٰ حسین کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا۔ اور اس گرفتاری کے موقع پر میرے بھائی کا رسمی خط اس کے کاغذات میں سے برآمد ہو گیا۔ گرفتار کرنے والوں کا یہ طریقہ تھا کہ وہ جسے گرفتار کرتے تھے اس کے قبضے میں جو کاغذات ہوتے تھے ان میں جس جس شخص کا نام لکھا ہوتا تھا اسے بھی گرفتار کر لیتے۔ خواہ وہ کاغذات قرض کے لین دین کی دستاویزات کیوں نہ ہوں۔

ایک بات ایسی تھی جو میں نے انٹیلی جنس والوں سے چھپا رکھی تھی۔ اس مخفی بات کا تعلق میری نظر میں ریاست کی سلامتی اور امن اور نظام حکومت سے قطعاً نہ تھا۔ لیکن میرے ایک دوست نے ——— جو نئی کھیپ میں آیا تھا ——— اس مخفی بات کا جسے میں نے تحقیقات کے ابتدائی ایام میں جان پر کھیل کر

چھپائے رکھا تھا، انکشاف کر دیا۔ میرا یہ دوست بھی اس بنا پر گرفتار کر لیا گیا تھا کہ یحییٰ حسین کے دوستوں میں سے کسی صاحب کے گھر میں ایک ایسا عید کارڈ پایا گیا جس پر میرے اس دوست کا نام تھا۔ بہر حال جب میرا دوست ابوزعبل جیل میں آیا، میں نے اسے ملتے ہی اس کی گرفتاری کا سبب بتا دیا۔ اور اسے تاکید کر دی کہ میں جس بات کو چھپا کر رکھنے کی پوری کوشش کر رہا ہوں اسے وہ بھی بھول جائے۔ لیکن اسے خدا معاف کرے جونہی اس پر تعذیب و تشدد کی بوچھاڑ ہوئی اس پر ہذیان کی کیفیت طاری ہو گئی اور اس نے ہر اس بات کی جسے وہ جانتا تھا یا نہیں، تصدیق کرنا شروع کر دی۔ اس کے سپاہیوں نے مجھے بھی طلب کر لیا۔ اور بس پھر کیا تھا۔ آفت ٹوٹ پڑی۔ دنیا اندھیر ہو گئی اور غلغلۂ رستا خیز برپا ہو گیا۔

پھر ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کا دن آیا۔ اور یہ دن بھی یوم الحشر سے کم نہ تھا۔ بالائی مصر سے نو گرفتاروں کی ایک بہت بڑی کھیپ جیل میں وارد ہوئی۔ ان کی تعداد ۹ سو سے زیادہ تھی۔ اس دور میں اقتدار کی قربان گاہ پر جو انسانی قربانی دی گئی ہے اس کا ایک بڑا حصہ ان لوگوں پر مشتمل تھا۔ ان سب کو فوجی افسران کی طرف سے حکم ملا کہ ایک جگہ پر اپنا سامان رکھ دیں۔ چنانچہ ہر شخص نے پریشان ہو کر اپنا اپنا سامان پھینک دیا۔ اور پھر یکایک ان لوگوں کے تن کے کپڑے اتار دیے گئے۔ اور ان پر لاٹھیاں برسنے لگیں۔ یہ مسکین دیہاتی برہنہ جسم مار کی شدت سے یوں اِدھر اُدھر دوڑنے لگے جیسے چوہے بدحواس ہو کر ایک بڑے پنجرے میں پھدک رہے ہوں۔ ان کی تعداد زیادہ تھی، اس لیے صحن میں دوڑ بھاگ کی زیادہ گنجائش نہ تھی۔ صحن کے منظر نے انہیں مزید سراسیمہ بنا دیا تھا ——— وہ منظر یہ تھا کہ لوہے کی سلاخوں پر کچھ انسان لٹک رہے ہیں۔ جگہ جگہ سے ان کا خون رس رہا ہے اور زخموں سے پیپ کی بدبو اُٹھ رہی ہے۔ خوف اور سراسیمگی کی وجہ سے یہ لوگ پاگل ہو ہو کر گر رہے ہیں۔

چیخنے کی آوازیں ہر جگہ سے سنائی دے رہی تھیں۔ لیکن ہم لوگ جو پہلے سے سلاخوں پر لٹکے ہوئے تھے، خوف و دہشت سے بڑی حد تک نجات پا چکے تھے کیونکہ ہم جلادوں سے مانوس ہو چکے تھے لیکن بار بار کوشش کے باوجود جس چیز سے میں نجات نہ پا سکا وہ تھا کرب!

میں نے دل کو بڑا سمجھایا کہ کرب درحقیقت انسان کے دماغ کے کسی گوشے میں ایک احساس اور تصور کا نام ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اور ایک تصور و احساس پر کسی دوسرے برتر مستحکم تر تصور و احساس کی مدد سے میں غلبہ پا سکتا ہوں۔ یوں احساسِ کرب معدوم ہو جائے گا اور دوسرا احساس اس کی جگہ لے لے گا۔

اس طرح کی باتیں اپنے دل سے میں ہر اُس موقع پر کرنے لگتا جب مجھے تعذیب کی ٹکٹکی پر لٹکنا ہوتا تھا۔ بلکہ میں ذہن کو اس فلسفے پر مرکوز بھی کر لیتا تھا۔ مگر تعذیب کی ایک ہی لپیٹ سے میرا سارا فلسفہ کافور ہو جاتا۔ ہو سکتا ہے کہ میرا یہ نظریہ اپنی جگہ درست ہو۔ لیکن یہ بھی تو ضروری ہے کہ قلب و دل احساس اپنی قوت و تاثیر اور سنگینی و شدت میں کرب سے فائق تر ہونا چاہیے۔

ابوزعبل کی جیل میں آغاز کار میں تعذیب کا دارومدار زیادہ تر ذہنی عذاب دینے پر ہوتا تھا — مثلاً یہ کہ انسان کو بالکل برہنہ کر دیا جاتا تاکہ انسان خود اپنی نظروں میں اپنی قیمت کھو بیٹھے۔ اور اُسے یہ محسوس ہونے لگے کہ وہ ایک ہیچ اور بے وزن مخلوق ہے۔ اور پھر اس کی زیادہ سے زیادہ توہین کی جاتی جو اُس کے دل و دماغ کے اندر ایک خوفناک تہلکہ برپا کر دینے والی چیز ہوتی تھی۔ اور اس کے بعد اُسے بے تحاشا زد و کوب کیا جاتا، آگ سے داغا جاتا، اور بھوک اور پیاس کی مار دی جاتی۔

ابوزعبل جیل کا بنیادی آلۂ ضرب ڈنڈا تھا۔ اور اس کے انتخاب میں بھی ایک راز پنہاں تھا۔ وہ یہ کہ ڈنڈا جسم پر گہرا اثر نہیں چھوڑتا۔ یا اس کی چوٹ کا زود یا بدیر علاج کیا جا سکتا ہے — اگرچہ اس ڈنڈے نے اکثر اوقات کئی مظلوم انسانوں کی جانیں لے لیں۔ جہاں تک چرمی تازیانے کا تعلق ہے تو انٹیلی جنس والے اسے شاذ و نادر ہی استعمال کرتے تھے۔ اور وہ بھی زیادہ تر خوف زدہ کرنے کے لیے۔ اس لیے کہ اس کے ہوا میں لہرانے سے ایسی پھنکار پیدا ہوتی تھی جو کڑیل سے کڑیل لوگوں کا پتہ بھی پانی کر دیتی تھی۔

ابوزعبل جیل کی انٹیلی جنس اور فوجی جیل کی کریمنل ملٹری انٹیلی جنس کے درمیان یہ فرق ہے کہ اوّل الذکر تعذیب و تشدد کے باب میں مہارت، چابکدستی اور فن کا زیادہ مظاہرہ کرتے ہیں اور ثانی الذکر سنگدلی اور تذلیل میں زیادہ بڑھ کر ہیں۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ سول انٹیلی جنس کی جیلوں میں جو لوگ موت کے گھاٹ اُترتے ہیں فوجی جیلوں میں مرنے والوں کی تعداد اُن سے دوگنا ہے۔

جس دوست کے بارے میں میں نے عرض کیا ہے کہ اس نے میرے پوشیدہ راز کو فاش کر دیا وہ عام الحزن یعنی ۱۹۶۵ء کے ماہ اپریل اور ماہ مئی میں میرے ساتھ باہمی مذاکرہ و مطالعہ میں اپنی شامیں گزارتا رہا ہے — یہاں یہ مناسب ہو گا کہ میں وہ راز بتا دوں جسے میں انٹیلی جنس والوں سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتا رہا ہوں — وہ راز تھا: ہم نے خالصتہً دینی اور علمی اور تربیتی سرگرمیوں کا ایک نظام

قائم کر رکھا تھا۔ ہم لوگ عالم اسلام کے حالات کا اجتماعی مطالعہ کرتے۔ ہم میں سے کچھ احباب اس موضوع پر لیکچر تیار کرتے۔ ہم نے اس دلچسپ پروگرام کا ایک عمدہ آغاز کر لیا تھا۔ ہم مطالعہ و تحقیق کی خاطر جمع ہوتے اور اس اجتماع کے ذریعے سے اپنی فکری اور ذہنی تربیت کرتے۔ یہ پروگرام مرحلہ آغاز ہی میں تھا کہ دارو گیر کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ اگر میں انٹیلی جنس کے افسران سے یہ بیان کر دیتا کہ ہم محض تعلیم و تربیت کی خاطر یہ پروگرام جاری کیے ہوئے تھے، تو وہ ہرگز مجھ پر یقین نہ کرتے۔ لہٰذا میں نے خوب غور و خوض کے بعد یہ طے کیا کہ یہ بات انہیں ہرگز نہیں بتاؤں گا۔ اسی دوران میرا دوست جیل میں آوارد ہوا۔ اور اس نے ہمارے اجتماعات کی کہانی بڑی سادگی کے ساتھ ارباب تفتیش کے سامنے بیان کر دی۔ مگر ان کے لیے یہ توجیہہ کافی ثابت نہ ہوئی کہ ہمارے اجتماعات محض علم و تربیت کی خاطر تھے۔ بلکہ انہیں اس میں کوئی شک نہ تھا کہ ہم حکومت کا تختہ اُلٹنے کے لیے میٹنگ کرتے رہے۔

مصر کے تحفظ امن عامہ کے تمام ادارے اس وہم میں مبتلا تھے کہ تمام مصری قوم عبد الناصر کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کی سازش کر رہی ہے۔ اور میرے دوست کے لیے بھی ناقابل تصور زد و کوب کے بعد کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ ہمارے اجتماع کے معاملے کو بھی ایک سازش تسلیم کرے۔ مگر اس سازش کو واضح اور مبرہن کرنے کے لیے ایک عمدہ کہانی تصنیف کرنے کی ضرورت تھی۔ اب یہ دقت پیش آئی کہ سازش کی مسلسل اور مربوط کہانی کیسے وضع کی جائے۔ گو ہم نے بہت کچھ تسلیم کر لیا تھا۔ مگر اس کے باوجود کہانی مکمل نہ ہو پائی۔ کسی اقرار نامے پر دستخط کر دینا آسان ہے مگر کہانی کی تصنیف بہت مشکل۔ میں پیچھے بیان کر چکا ہوں کہ تفتیش کے پہلے ہی مرحلے میں مَیں نے وہ سب کچھ تحریر کر دیا جو میجر ف۔ ع نے مجھے املا کروایا تھا۔ اور اس پر میں نے بقلم خود دستخط بھی کر دیے تھے۔ اور اب تو مجھے یہ بھی پوری طرح یاد نہیں آ رہا کہ میری تحریر کے اصل الفاظ اور مضمون کیا تھا لیکن یہ خوب یاد ہے کہ کہانی بڑی بے ڈھب اور بے ربط اور بے جان تھی — ایک ایسی من گھڑت سازش کی کہانی جو ایک ایسی حکومت کے خلاف کی گئی جسے قوم دل کی گہرائیوں سے ناپسند کرتی تھی اور جس سے نجات پانے کے لیے وہ گن گن کر گھڑیاں گزارتی رہی۔ (باقی)